پہلی بات ہی آخری تھی
منیر نیازی

زندگی کے
ایک اندوہناک تجربے سے گزرنے کے بعد
مُنیر نے
اپنے ریزہ ریزہ وجود کو
پھر سے مجتمع کر لیا ہے ــــ!
کیوں کہ
وہ جانتا ہے
کہ
"ہر ایک سخت وقت کے بعد اور وقت ہے"
خالد شریف
سرورق:
رانا ریاض احمد
قیمت : 40 روپے

پہلی بات ہی آخری تھی
منیر نیازی

نذیر ہاشمی
غلام رسول اظہر
جون ۱۹۸۶ء

ترتیب

اِنتساب

مرحومہ

صُغرا خانم کے نام

مُنیر نیازی

وہ جو منکشف ہے جگہ جگہ
وہ جو سب سے آخری راز ہے

عجزِ بیانِ حسابِ زندگی

ایک بے رشتہ جہاں میں عالمِ خلقِ خُدا
اور اُس کے درمیاں اعلانِ فکرِ رہ نما

ایک باطل وقت کے شام و سحر میں زندگی
ایک گُم گشتہ حقیقت کے نگر میں زندگی

جس میں ناموجود تھا مَیں وہ زمانہ دُور کا
جس میں ناآباد تھا مَیں وہ زمانہ دُور کا

وہ فضا اُس دَور کی اس میں جمالِ مصطفےٰؐ
جہل کی تاریکیوں میں شہر سا اِک نُور کا

اِس زمانے میں مَیں اُس کا ذکر کرتا کس طرح
اُس زمانے کے سخن میں فکر کرتا کس طرح

بابِ روشن اس قدر تھا اُس جہانِ حُسن کا
رعبِ دل میں اس قدر تھا اس بیانِ حُسن کا

حوصلہ مُجھ میں نہ تھا تو بات کہتا کس طرح
یہ مِرا منصب نہ تھا تو نعت کہتا کس طرح

اُس وقت میں اُس شہر میں موجود نہیں تھا

جس وقت اُڑی بلبل بادل کے گرجنے سے

تھرّائیں ہری شاخیں بوندوں کے برسنے سے

میداں تھا بہت خالی موسم کے بدلنے سے

روشن تھا سرِ میداں اِک آگ کے جلنے سے

آواز ہُوئی غالب اس منظرِ دُنیا پر

اک علم نیا چمکا آثارِ زمانہ پر

جب پھر سے ملے دونوں دُوری کے مکانوں میں

اس وسعتِ ہستی کے مستور زمانوں میں

مَیں اور صحرا

ہم نے اکٹھے دُکھ سُکھ کاٹے راحت اور مجبُوری کے
وصل کی جھلمل جھلمل راتیں دن غُربت کی دُوری کے

اک ناواقف شہر کے اندر چھُپے ہُوئے شرمائے ہُوئے
دو جنگوں میں ساتھ رہے ہم ڈرے ہُوئے گھبرائے ہُوئے

بگڑے ہُوئے رشتوں کے جنگل ، وحشت کے صحراؤں میں
ہم نے اکٹھے عمر بتا دی وقت کی دُھوپ اور چھاؤں میں

اپنے وطن کے لئے

زندگی اپنی وطن کی زندگی کا نام ہے
نام اس کا زندگی میں روشنی کا نام ہے

اپنے اہلِ فکر سے اس کی خبر ہم کو ملی
اک نئی اُمید کی صبحِ سفر، ہم کو ملی
یہ زمیں اسلام سے وابستگی کا نام ہے
زندگی اپنی وطن کی زندگی کا نام ہے
قائداعظم نے اس کی راہ دکھلائی ہمیں
اس مقامِ شوق پر اس کی صدا لائی ہمیں
مُلکِ پاکستان شہرِ آگہی کا نام ہے
زندگی اپنی وطن کی زندگی کا نام ہے

اس ہدی خواں کی رفاقت میں عمل کے قافلے
چل رہے ہیں کل زمیں کے خوابِ راحت کے لیے
اپنا مقصد ساری دُنیا کی خوشی کا نام ہے
زندگی اپنی وطن کی زندگی کا نام ہے

شہرِ نامعلوم کی جادوگری کچھ کم ہوئی
اس سفر میں شوق کی دیوانگی کچھ کم ہوئی

حُسن جو دیکھا نہیں تھا اُس کو دیکھا سامنے
صُبح و شامِ زندگی میں اک کمی کچھ کم ہوئی

بے یقینی دل کی تھی کچھ پردہ داری کے سبب
صاف مِلنے سے اُسے بیگانگی کچھ کم ہوئی

غم رُبا تھی سیرِ دُنیا ہجر کے آزار سے
اس طرح دِل میں جو تھی افسردگی کچُھ کم ہُوئی

حد بنانی تھی کہیں لا انتہا میں اے مُنیرؔ
گھر بنا کر ذہن کی آشفتگی کچُھ کم ہُوئی

مَیں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا

باغ میں جنگل سا اُگ آیا ہے
خود روئیدگی نے خاک کے اس ٹکڑے میں
دُھوم اُٹھا رکھی ہے
مَیں چاہتا ہُوں یہ پھر سے ایک ترتیب میں آ جائے
پھر سے باغ بن جائے ـــــــ
مگر وقت گزر جاتا ہے اور مَیں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا

گمشدہ ننھا بچہ

"میرے بابا — میرے بابا —! تم کہاں جا رہے ہو؟
خدا کے لیے اتنا تیز نہ چلو
بات کرو، میرے بابا! اپنے ننھے بچے سے کوئی بات کرو،
نہیں تو مَیں گُم ہو جاؤں گا —"

رات تاریک تھی، باپ وہاں نہیں تھا
بچہ شبنم سے تھا بھیگ گیا
دلدل گہری تھی اور بچہ رو دیا ہو کے مجبور
اور پھر دُھند اُڑ گئی بہت دُور

سپنا آگے جاتا کیسے

چھوٹا سا اک گاؤں تھا جس میں

دیئے تھے کم اور بہت اندھیرا

بہت شجر تھے تھوڑے گھر تھے

جن کو تھا دُوری نے گھیرا

اتنی بڑی تنہائی تھی جس میں

جاگتا رہتا تھا دل میرا

بہت قدیم فراق تھا جس میں

ایک مقرّر حد سے آگے

سوچ نہ سکتا تھا دل میرا
ایسی صورت میں پھر دل کو
دھیان آتا کس خواب میں تیرا
راز جو حد سے باہر میں تھا
اپنا آپ دکھاتا کیسے
سپنے کی بھی حد تھی آخر
سپنا آگے جاتا کیسے

تھی جس کی جستجو وہ حقیقت نہیں ملی
ان بستیوں میں ہم کو رفاقت نہیں ملی

ابتک ہیں اس گماں میں کہ ہم بھی ہیں دہر میں
اس وہم سے نجات کی صُورت نہیں ملی

رہنا تھا اس کے ساتھ بہت دیر تک مگر
ان روز و شب میں مُجھ کو یہ فرصت نہیں ملی

کہنا تھا جس کو اُس سے کسی وقت میں مجھے
اس بات کے کلام کی مہلت نہیں ملی

کچھ دن کے بعد اُس سے جُدا ہو گئے منیرؔ
اُس بے وفا سے اپنی طبیعت نہیں ملی

حرف

اتنی آساں زندگی کو اتنا مشکل کر لیا
جو اُٹھا سکتے نہ تھے وہ غم بھی شامل کر لیا

بارِ ہستی ہی بہت تھا بستیوں کی زیست میں
نیستی کے خوف کو بھی خواہشِ دل کر لیا

ہم تھے تنہا بے روایت ساعتوں کی قید میں
جس سبب سے ہم نے خود کو اتنا مہمل کر لیا

اُس دن

میری بات کے جواب میں
اُس نے بھی بات کی
اُس کے بات کرنے کے انداز میں
دیر کے گرے ہُوئے لوگوں، ڈرا دیے گئے شہروں کا عجز تھا
جو پختہ ہو گیا تھا

اُس دن مَیں دیر تک اُداس رہا
کیا حُسن تھا کہ غرورِ حُسن بھُول گیا
اتنے برسوں میں اُس پر کیا بیتی
مَیں نے اُس سے نہیں پُوچھا

اِس شامِ نوبہار میں

اس شامِ نوبہار میں آئے کہاں سے ہو
خوش خبریاں ہواؤں میں لائے کہاں سے ہو

پھیلی مہک سہاگ کی جامِ شراب سے
تازہ کھِلے گلاب کی شہرِ خراب سے
خوشبو مکانِ دُور کی لائے کہاں سے ہو

آئی صدا حبیب سی بزمِ جمال سے
پیدا ہُوئی مثال سی خوابِ خیال سے
آئندہ کے جواب کے دائم سوال سے
اتنے بڑے خمار کو لائے کہاں سے ہو

لفظوں اور نظموں کے اپنے موسم ہوتے ہیں

اک سپنے میں دو تین صدیاں،
کچھ ٹوٹی کچھ جڑی ہوئیں

اپنے اپنے وہم میں پکڑی
آس پاس ہیں کھڑی ہُوئیں

ایک سرے پر فوجیں ہی فوجیں
بستیاں آگ میں جلی ہُوئیں

ایک طرف آباد گھروں پر
راتیں تاروں جڑی ہُوئیں

ایک طرف پر روشن راہیں
غیب کے اندر گئی ہُوئیں

اِک رَستے پر بیریوں پیچھے

ناریں کوٹھوں چڑھی ہُوئیں

اور اِک صدی کے بچّے لے کر

اور اِک صدی میں کھڑی ہُوئیں

اُس کا نقشہ ایک بے ترتیب افسانے کا تھا
یہ تماشا تھا یا کوئی خواب دیوانے کا تھا

سارے کرداروں میں بے رشتہ تعلق تھا کوئی
ان کی بے ہوشی میں غم سا ہوش آ جانے کا تھا

عشق کیا ہم نے کیا آوارگی کے عہد میں
اک جتن بے چینیوں سے دل کو بہلانے کا تھا

خواہشیں ہیں گھر سے باہر دُور جانے کی بہت
شوق لیکن دل میں واپس لوٹ کر آنے کا تھا

لے گیا دل کو جو اس محفل کی شب میں اے مُنیرؔ
اُس حسیں کا بزم میں انداز شرمانے کا تھا

غم میں تمام رات کا جاگا ہُوا تھا مَیں
صُبحِ چمن میں چَین سے سویا ہُوا تھا مَیں

اِک ہفت رنگ ہار گرا تھا مرے قریب
اِک اجنبی سے شہر میں آیا ہُوا تھا مَیں

ترتیب مُجھ کو پھر سے نئی عمر سے دیا
اک عمر کے طلسم میں بکھرا ہُوا تھا مَیں

پہچان سا رہا تھا مَیں اطرافِ شام میں
ان راستوں سے پہلے بھی گُزرا ہُوا تھا مَیں

مَیں ڈر گیا تھا دستکِ غمخوارِ یار سے
کُچھ حادثاتِ دہر سے سہما ہُوا تھا مَیں

کھو گیا مَیں خواہشِ بے نام میں مُنیرؔ
گھر سے کسی تلاش میں نکلا ہُوا تھا مَیں

رہِ شوق سیرِ مدام پر

رہِ شوق سیرِ مدام پر
کسی ایک خاص مقام پر
جو حیاتِ ذات کا حال ہے
اسے کہنا حرفِ محال ہے
بڑی دُور دُور کے سلسلے
ہیں اسی کے ساتھ جُڑے ہُوے
کِسی آگہی کے نشان سے
کسی زندگی کے گمان سے

بے خوابی کی ایک نظم

ایک جسم کو دوسرے جسم کے بنا
نیند نہیں آتی

وہ بے چین سا رہتا ہے
ساری بات ہے آنند کی
وہ آنند شراب کے گلاس میں ہے
یا کوئی دُعا ہے بچپن کی، سونے سے پہلے کی
کوئی تاکید ہے ماں کی
یا کوئی آنکھ ہے جس میں التفات کی نظر تھی

سائے گھٹتے جاتے ہیں
جنگل کٹتے جاتے ہیں

کوئی سخت وظیفہ ہے
جو ہم رٹتے جاتے ہیں

سورج کے آثار ہیں دیکھو
بادل چھٹتے جاتے ہیں

آس پاس کے سارے منظر
پیچھے ہٹتے جاتے ہیں

دیکھ منیرؔ بہار میں گلشن
رنگ سے اُڑتے جاتے ہیں

درخت بارش میں بھیگتے ہیں

کہ جیسے بھٹکے ہُوئے مسافر
درخت بن کر کھڑے ہُوئے ہیں
اک اور منظر میں جا بسیں گے
کچھ اس طرح سے رُکے ہُوئے ہیں
ذرا سی مہلت جو مل گئی ہے
خرابیاں ان میں آ گئی ہیں
جو فاصلے ان کے بیچ میں ہیں
اُداسیاں اُن میں اُگ رہی ہیں

کوئی فسانہ سا ہے یہ منظر

خراب و خوب جہانِ ثابت

فنا بقا سارے ساتھ مل کر

جسے بکھرنے سے روکتے ہیں

درخت بارش میں بھیگتے ہیں

جن وقتوں میں بیلیں درختوں پر چڑھتی ہیں
جن وقتوں میں رُوحیں نئے علم پڑھتی ہیں

سارے جہاں کے اُوپر اِک رنگ چمکتا ہے
جس کے اثر سے ظاہر ہوتا ہے رُوپ آنکھ کا

فرقت کے موڑ پر کچھ یار مل رہے ہیں
جسموں کی حد کے اندر کچھ خواب کھل رہے ہیں

ہے یہی پہچان تیری اے جمالِ خوش ادا
رُوح کو بے چین کر دیتا ہے تیرا دیکھنا

کچھ گزشتہ اور آئندہ بہت ہی دُور سے
یاد آتے ہیں فسردہ اور کچھ مسرُور سے

آشوبِ شہر

اس خلائے شہر میں صُورت نما ہوتا کوئی
اس نگر کے کاخ و کُو میں بُت کدہ ہوتا کوئی

منتشر افکار کی تجسیم تو ہوتی کہیں
سامنے اپنی نظر کے جسم سا ہوتا کوئی

یوں نہ مرکز کے لیے بے چین پھرتا مَیں کبھی
پیکرِ سنگیں سہی اپنا خُدا ہوتا کوئی

وہ جو مَیں نے کھو دیا ہے اس جہاں کے شوق میں
اُس جہانِ گم شُدہ کا راستہ ہوتا کوئی

مَیں مُنیرؔ آزردگی میں اپنی یکتائی سے ہُوں
ایسے تنہا وقت میں ہمدم مرا ہوتا کوئی

تین عمریں گزرنے کے بعد بھی

یہ شجر جو شامِ خزاں میں ہیں
جو مکاں ہیں ان کے قریب کے
کسی عمر کی کوئی یاد ہیں
یہ نشان شہرِ حبیب کے
انھیں دیکھتا ہُوں مَیں چُپ کھڑا
جو گزر گئے اُنھیں سوچتا
یہ شجر جو شامِ خزاں میں ہیں
جو مکاں ہیں ان کے قریب کے
انہی بام و در میں مقیم تھے
وہ مکین شہرِ قدیم کے

ہم شک کے موسموں میں پیدا ہوئے

خموشی نے صدا ہونا نہیں ہے
درِ زنداں کو وا ہونا نہیں ہے

یہی سوچا مسلسل غم میں رہ کر
ہمیں غم سے رِہا ہونا نہیں ہے

مِلا ہُوں یوں کسی گُل رُخ سے جیسے
کبھی اُس سے جُدا ہونا نہیں ہے

پرستش کر رہے ہیں اُن بُتوں کی
جنھیں اپنا خُدا ہونا نہیں ہے

مُنیر اس خوب صورت زندگی کو
ہمیشہ ایک سا ہونا نہیں ہے

پہلی بات ہی آخری تھی

پہلی بات ہی آخری تھی
اس سے آگے بڑھی نہیں
ڈری ہُوئی کوئی بیل تھی جیسے
پُورے گھر پہ چڑھی نہیں
ڈر ہی کیا تھا کہہ دینے میں
کُھل کر بات جو دل میں تھی
آس پاس کوئی اور نہیں تھا
شام تھی نئی محبّت کی

ایک جھجک سی ساتھ رہی کیوں

قربت کی ساعتِ حیراں میں

حد سے آگے بڑھنے کی

پھیل کے اس تک جانے کی

اُس کے گھر پر چڑھنے کی

یورشِ سختِ جبر میں خواہشِ جام سی کبھی
عیشِ دوام سی کبھی ان ہوئے کام سی کبھی

صبحِ بہار میں کبھی ، صحنِ خزاں میں بھی کبھی
بجھتا ہُوا شرر کبھی رنگوں کی شام سی کبھی

اور کسی جہان میں ، حاضرِ جان سی کبھی!
غیبوں کے سحرِ دور میں ساعتِ عام سی کبھی

برقِ بہار ہے یا ہے کوئی سکوتِ غم فزا
رنگِ خموشِ در کبھی ، رونق بام سی کبھی

مثلِ خیالِ خامِ دل جیسے کہیں رُکی ہُوئی
ثابت ماہ و سال میں سیرِ مدام سی کبھی

ہے یہ منیرؔ شاعری میری فضائے زندگی
شاملِ حال سی کبھی ماضی کے دام سی کبھی

محبت اب نہیں ہو گی

ستارے جو دمکتے ہیں
کسی کی چشمِ حیراں میں
ملاقاتیں جو ہوتی ہیں
جمالِ ابر و باراں میں
یہ نا آباد وقتوں میں
دلِ ناشاد میں ہو گی
محبت اب نہیں ہو گی
یہ کچھ دن بعد میں ہو گی
گزر جائیں گے جب یہ دن
یہ ان کی یاد میں ہو گی

کتنے غم چھوٹے لگے
خوشی بھی کوئی غم لگتی تھی
ایسے اس پر چھائے تھے

مٹی کے ساتھ ایک سیاہ دھبہ ہے

چنتا کیسی ہے من میرے

بپتا جیسی ہو کچھ جیسے

برہا جیسی ہو کچھ جیسے

یادیں جیسے ہوں کچھ ٹوٹی

کونپل کوئی جو پھر پھوٹی

کوئل کوئی جو پھر کوکی

عمریں جیسے واپس آئیں

رشتے جیسے کم ہو جائیں

مدھم جیسے غم ہو جائیں

برکھا جیسی ہو کچھ جیسے

پُروا جیسی ہو کچھ جیسے

چنتا کیسی ہے ——

ہے اُس کے گرد یہ محفل جو اِک سوال میں چُپ
لگی ہے اُس کو بھی ایسے کسی خیال میں چُپ

ہے ایک طرفہ تماشہ طبیعتِ عشاق !
کبھی فراق میں باتیں کبھی وصال میں چُپ

خبر ہے اُس کو بہت وقت کے گزرنے کی
ہے حُسن اپنے ہی اندوہِ لازوال میں چُپ

نگہ میں حُسنِ بیاں جن کے بولنے سے تھا
ہُوئے وہ اہلِ ہُنر رنجشِ زوال میں چُپ

بہت کلام گزشتہ میں کر چکے ہیں مُنیرؔ
دکھائی دیتے ہیں ہم جو بیانِ حال میں چُپ

میرا اشانت ہونا

دو خوبصورت عورتیں غرّا رہی ہیں

بجلیوں کی چمک میں

وقفے وقفے سے بوچھاڑ کی طرح آتی ہَوائیں

دو خوبصورت عورتیں

دل کی وحشت میں غرّا رہی ہیں

یہ اشانت عورتیں مجھے اشانت کرتی ہیں

یہ نہیں کہ موسم کا مُجھ پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا

پر میرے دِل میں فکر اتنا ہے

کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلتا میرے آس پاس کیا ہو رہا ہے
کتنا وقت گزر گیا ــــ اور کیسے گزر گیا
بس کبھی کبھی موسم کی وجہ سے
کبھی کبھی عورتوں کی وجہ سے اشانت سا ہو جاتا ہوں

خوبصورت عورتیں

کھڑکیوں جھروکوں کی
گُل ہَوا کے جھونکوں میں
بن سنْور کے بیٹھی ہیں
مختلف زمانوں میں
تن بدلنے جاتی ہیں
تن بدل کے آتی ہیں
اَور بیٹھ جاتی ہیں
کھڑکیوں جھروکوں کے

دلنواز دھوکوں میں
دلکشی کی یہ فرقت
اِک عجیب جنّت ہے
خواب ہے حقیقت کا
مشکلوں میں فرصت ہے

اس طرح کی جنّت میں
سانپ تک نہیں آتا
اس سکونِ خوش دل میں
اس خموشش راحت میں
مور تک نہیں گاتا

کوئی اور طرح کی بات کرو

کوئی اور طرح کی بات کرو ـــــ!
دل جس سے سب کا بہل جائے
دھیان اور طرف کو نکل جائے
کوئی اور طرح کی بات کرو ـــ!
دھیان اور طرف کو نکل جائے
کسی اور خیال میں ڈھل جائے
بے مصرف دن کے آخر پر
یہ ڈھلتی شام سنبھل جائے
اس سخت مقام زمانے کا
یہ سخت مقام بدل جائے
کوئی اور طرح کی بات کرو

کسی گھاٹ پہ کشتی آن لگے
کوئی نئی نئی پہچان لگے
کوئی نیا نیا انجان لگے
بے مصرف دن کے آخر پر
یہ ڈھلتی شام سنبھل جائے
کوئی اور طرح کی بات کرو

لمحہ لمحہ دم بہ دم
بس فنا ہونے کا غم

ہے خوشی بھی اس جگہ
اے مری خُوئے الم

کیا وہاں بھی ہے کوئی
اے رہِ مُلکِ عدم

رونقِ اصنام سے
خم ہُوئے غم کے عَلَم

یہ حقیقت ہے منیرؔ
خواب میں رہتے ہیں ہم

گہری گہری تکتی آنکھیں
راز چھپا کر رکھتی آنکھیں

صاف آئینے میں بھی جیسے
خود کو دیکھ نہ سکتی آنکھیں

کُل عالم میں دیکھیں مَیں نے
دیکھ دیکھ کر تھکتی آنکھیں

پل دو پل کو ظاہر ہو کر
پردوں میں جا بستی آنکھیں

بادل ، باغ ، بہار ، منیرؔ
دیواروں پر ، ہنستی آنکھیں

ہونی کے حیلے

کس کا دوش تھا کس کا نہیں تھا
یہ باتیں نہیں اب کرنے کی
وقت گزر گئے توبہ والے
راتیں نہیں آہیں بھرنے کی
جو بھی ہُوا وہ ہونا ہی تھا
ہونی روکے رُکتی نہیں
ایک بار جب شروع ہو جائے
بات پھر ایسے رُکتی نہیں

کچھ یوں بھی راہیں مشکل تھیں
کچھ گلے میں غم کا طوق بھی تھا
کچھ شہر کے لوگ بھی ظالم تھے
کچھ مجھے مرنے کا شوق بھی تھا

(اپنی پنجابی نظم کا ترجمہ)

کیسی جگہ پر چل کر بیٹھیں

کس ایوان میں مل کر بیٹھیں
کس مرکز، کس رستے پر
کس افسوس کے مسکن جاں میں
کس شادی کے چشمے پر
دل کی بات جہاں ہم بانٹیں
ان وقتوں میں رہنے کی
دل لگ جائے جن شہروں میں
اُن شہروں میں رہنے کی

ہماری ساری عمر

اپنی کم علمی اور نادانی کو

چھپانے میں گزر جاتی ہے

پھر صبح کی ہوا میں جی میں ملال آئے
جس سے جُدا ہُوئے تھے اُس کے خیال آئے

اس عمر میں غضب تھا اُس گھر کا یاد رہنا
جس عمر میں گھروں سے ہجرت کے سال آئے

اچھی مثال بنتیں ظاہر اگر وہ ہوتیں
اُن نیکیوں کو ہم تو دریا میں ڈال آئے

جن کا جواب شاید منزل پہ بھی نہیں تھا
رستے میں اپنے دل میں ایسے سوال آئے

کل بھی تھا آج جیسا ورنہ منیرؔ ہم بھی
وہ کام آج کرتے کل پر جو ٹال آئے

جفائیں دُور تک جاتی ہیں کم آباد شہروں میں
وفائیں دُور تک جاتی ہیں کم آباد شہروں میں

بہاریں دیر تک رہتی ہیں کم آباد قریوں میں
خزائیں دُور تک جاتی ہیں کم آباد شہروں میں

صدا ہنسنے کی ہو افسوس کی یا آہ بھرنے کی
صدائیں دُور تک جاتی ہیں کم آباد شہروں میں

اندھیرا جب گھنا ہو تو چراغِ راہِ ویراں کی
شعاعیں دُور تک جاتی ہیں کم آباد شہروں میں

مُنیرؔ آباد شہروں کے مکینوں کی ہوا لے کر
ہَوائیں دُور تک جاتی ہیں کم آباد شہروں میں

کشش اور ردِ کشش

سارے عالم میں مراکز ہیں خوشی کے
عورتوں کے باغ کے
ایک پل کی اور کافی دیر تک کی دوستی کی
صورتوں کے باغ کے
ہیں خیاباں در خیاباں رشتہ ہائے زندگی
مستقل اور عارضی
سب گزرگاہوں سے ہو کر
ہم کو جانا ہے کہاں
سب خیابانوں میں پھر کر
ہم کو آنا ہے کہاں

اتنا بڑا بندھن بھی نہیں ہے
جو توڑیں تو ٹوٹ نہ جائے

اُس کا میرا رشتہ کیا ہے

قُرب کا معمولی رشتہ ہے کچھ دن ساتھ گزارنے کا

سب کچھ ان بیتے جیسا ہے

وقت کا اک ٹکڑا سا جیسے

گھاٹ پہ اک لمحہ سا جیسے دریا پار اُتارنے کا

خیال جس کا تھا مجھے خیال میں ملا مجھے
سوال کا جواب بھی سوال میں ملا مجھے

گیا تو اس طرح گیا کہ مدتوں نہیں ملا
ملا جو پھر تو یوں کہ وہ ملال میں ملا مجھے

تمام علم زیست کا گزشتگاں سے ہی ہوا
عمل گزشتہ دور کا مثال میں ملا مجھے

ہر ایک سخت وقت کے بعد اور وقت ہے
نشاں کمالِ فکر کا زوال میں ملا مجھے

نہالِ سبز رنگ میں جمال جس کا ہے منیرؔ
کسی قدیم خواب کے محال میں ملا مجھے

اُداسی کو بیاں کیسے کروں مَیں
خموشی کو زباں کیسے کروں مَیں

بدلنا چاہتا ہُوں اس زمیں کو
یہ کارِ آسماں کیسے کروں مَیں

بھروسہ ہی نہیں مجُھ کو کسی پر
کسی کو رازداں کیسے کروں مَیں

شبِ دیجور ہے اور سوچتا ہُوں
فلک کو کہکشاں کیسے کروں مَیں

کِسی جنگل کا طائر ہُوں مَیں اے دل
گلُوں میں آشیاں کیسے کروں مَیں

مُنیرؔ اِس عہدِ آشفتہ سری میں
خیالِ جسم و جاں کیسے کروں مَیں

نئی نئی پرستش

گِھرا ہے یوں ہجوم میں
کہ جیسے ماہِ شام کا
نئے نئے نجوم میں
چمک جو ہر نظر میں ہے
وہ اس سے بے خبر نہیں
جو بات سب کے دل میں ہے
وہ اس سے بے خبر نہیں

ذرا ذرا سی بات کا
تمام علم اس کو ہے
ہر ایک دن کی رات کا
حیاتِ خوشں خرام میں
کوئی نیا مکان ہے
نئے قمر کی شام میں

یہاں ہے ہر ایک شے کی ہستی
نہیں کی ہستی میں ہے کی ہستی

حرام ہے جن میں مے پرستی
ہے اُن دنوں میں ہی مے کی ہستی

خزاں کا بے برگ و ساز ہونا
اسی سے ہے برگِ نے کی ہستی

دَم پریشاں سے ہو گئی ہے
وجود میں ہے جو لَے کی ہستی

مُنیرؔ ہم کو مِلی ہے کیسی
مصیبتِ پَے بہ پَے کی ہستی

سیاہی شب کی مدھم ہو گئی ہے
یہ شب کچھ اور مُبہم ہو گئی ہے

لیے جاتی ہے سارے خواب میرے
یہ رُت ہجرت کا عالم ہو گئی ہے

اُداسی اِس میں ہے صُبحِ ازل کی
ہَوا کیسی سَحَر دَم ہو گئی ہے

کہ جیسے جانتی ہے راز سارا
حیات انکارِ پیہم ہو گئی ہے

منیرؔ انجام رنج رائیگاں ہے
اذیت ہجر کی کم ہو گئی ہے

یہ بے قاعدہ سے دن

وہ نظریں جو راہ دکھاتی ہیں
دُھندلی ہے
وہ باتیں جو راہ دکھاتی ہیں
دُھندلی ہے
وہ شامیں جو راہ میں آتی ہیں
دُھندلی ہیں
وہ صُبحیں جو راہ میں آتی ہیں
دُھندلی ہیں

جو شکلیں بیچ میں آتی ہیں
دُھندلی ہیں
جو سوچیں بیچ میں آتی ہیں
دُھندلی ہیں

اُس سمت مُجھ کو یار نے جانے نہیں دیا
اِک اور شہرِ یار میں آنے نہیں دیا

کُچھ وقت چاہتے تھے کہ سوچیں ترے لیے
تُو نے وہ وقت ہم کو زمانے نہیں دیا

منزل ہے اس مہک کی کہاں، کس چمن میں ہے
اس کا پتہ سفر میں ہَوا نے نہیں دیا

روکا انا نے کاوشِ بے سُود سے مجھے
اُس بُت کو اپنا حال سُنانے نہیں دیا

ہے جس کے بعد عہدِ زوال آشنا مُنیرؔ
اتنا کمال ہم کو خُدا نے نہیں دیا

غم سے لپٹ ہی جائیں گے ایسے بھی ہم نہیں
دُنیا سے کٹ ہی جائیں گے ایسے بھی ہم نہیں

دن رات بانٹتے ہیں ہمیں مختلف خیال
یوں ان میں بٹ ہی جائیں گے ایسے بھی ہم نہیں

اتنے سوال دل میں ہیں اور وہ خموش در
اُس در سے ہٹ ہی جائیں گے ایسے بھی ہم نہیں

ہیں سختیٔ سفر سے بہت تنگ پر مُنیرؔ!
گھر کو پلٹ ہی جائیں گے ایسے بھی ہم نہیں

یہاں سے جا چُکا ہے جو اُسے کم یاد کرنا ہے
کہ بے آباد گھر کو پھر مجھے آباد کرنا ہے

اُردو شاعری کا یہ عہد مُنیر نیازی کا عہد
ہے ۔ گزشتہ تین دہائیوں میں ان کی شاعری
نے تین نسلوں پر گہرے اثرات مرتّب کیے
ہیں، اور اپنے ہونے کے ایسے نقش کندہ
کیے ہیں کہ وہ اپنے عہد کا Legend بن
گئے ہیں اور ان کی شاعری کلاسیکی درجہ پا
گئی ہے ۔ اُن کا خیال، اُن کا اظہار، اُن کا
ڈکشن، اُن کا شعری ماحول اور فضا ہر چیز
اُن کی اپنی ہے ۔ اُنھوں نے اُردو شاعری
کی کسی موجودہ یا کلاسیکی روایت یا دبستان
کا اثر قبول نہیں کیا بلکہ ایک نئے دبستان
کی طرح ڈالی ہے ۔ بہرحال اُن کی شاعری
کی تقلید تقریباً ناممکن ہے ۔ کیوں کہ یہ وہ
طلسماتی جزیرہ ہے کہ جس کا نظارہ صرف باہر
سے کیا جا سکتا ہے ۔ مُنیر نیازی کی
شاعری ایک عصر کی بشارت ہے اور اُن
کا اسلوب "اسلوبِ مُنیر" ہے ۔
شبنم شکیل